

انیسویں صدی کے ہندوستان کی ہیئت شرعی

(شاہ عبدالعزیز کے فتاویٰ دارالحرب کا ایک علمی تجزیہ)

ڈاکٹر مشیر الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ، ڈی (میکگل)

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آخر اٹھارہویں صدی تک ہندوستان کے منحل حکمران اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود اس ملک کے شہنشاہ سمجھے جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کم سے کم ہندوستانی مسلمانوں کی نظر میں یہ ملک اصولی طور پر دارالاسلام کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ۱۸۳۳ء میں دلی پر انگریزوں کا سیاسی تسلط ہو جانے کے بعد صورت حال میں تبدیلی آگئی اور لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہونے لگا کہ دارالسلطنت پر انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بھی ہندوستان کو دارالاسلام ہی سمجھا جائے یا اسے دارالحرب کہا جائے۔ یہ سوال ذہنوں میں آیا ہی کیوں اور اس سوال کے پوچھنے کا مقصد کیا تھا۔ اس پر ہم آئندہ صفحات میں بحث کریں گے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز (۱۸۵۹ = ۱۲۶۶ھ) انہوں نے ہندوستان کو دارالحرب ہونے کا فتوے دیا۔

شاہ صاحب کے فتوے دینے کے تقریباً سو سال کے اندر اندر ہندوستان کی سیاسی صورت میں نمایاں تبدیلیاں آگئیں۔ وہی ہندوستانی جنہوں نے ۱۹ ویں صدی میں انگریزوں کو بحریرضا اس ملک کا مطلق العنان حاکم تسلیم کر لیا تھا۔ بیسویں صدی میں آزادی کی

خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ آزادی کی اس جنگ میں مذہب ملت کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ درحقیقت یہ جنگ تھی ملکی اور غیر ملکی کے درمیان۔ انگریز غیر ملکی تھے انہیں ملک بدر کرنے کے لئے ہر ملکی کو خواہ وہ کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔ متحد ہونا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہیں متحد ہونا تھا بلکہ جنگ آزادی کی فوج میں نئے سپاہیوں کو بھرتی کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ لیڈر عوام میں یہ احساس پیدا کریں کہ ان کی انگریز دشمنی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے وقت ہی سے ان کے بزرگ انگریز دشمن رہے ہیں مسلمانوں میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ان علماء نے جو جنگ آزادی میں پیش پیش تھے۔ شاہ صاحب کے فتوے دارالحرب کے کام لیا۔ عام طریقہ سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایک دارالاسلام جب دارالحرب ہو جاتا ہے تو وہاں کے مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس ملک کو پھر سے دارالاسلام بنانے کے لئے اپنی ہر ممکنہ قوت استعمال کریں۔ اور اگر پوری کوشش کے باوجود انہیں کامیابی نہ ہو تو پھر ایسے ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس پس منظر میں جب شاہ صاحب کے فتویٰ کی اشاعت کی گئی تو اس کا لازمی نتیجہ لوگوں نے یہی نکالا کہ انہیں ہندوستان کی آزادی کی خاطر انگریزوں سے جنگ کرنی ہے اور اگر اس جنگ میں انہیں شکست ہو تو پھر ملک سے ہجرت کر جانا ضروری ہے کیوں کہ ان کے بزرگ شروع سے ہی کرتے (یا کہتے) آئے ہیں۔

۲۰ ویں صدی کا ابتدائی حصہ ہندوستان میں سیاسی حیثیت سے تاریخ کی حسبِ متناہجیر و تشریح کے لئے بہت مناسب تھا۔ اس لئے جب کہنے والوں نے یہ کہا کہ شاہ صاحب نے اپنے فتویٰ کے دوسرے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے یہ ضروری قرار دیا تھا کہ وہ یا تو انگریزوں سے جنگ کریں یا بددبہ مجبوری اس ملک سے ہجرت کر جائیں، تو کسی کو بھی اس میں کوئی عجب و نظر نہ آیا۔ کسی نے بھی سوچنے کی اتنی زحمت گوارا نہ کی کہ اس تشریح و تعبیر میں حقیقت کا شائبہ کہاں تک ہے۔ اس وقت چونکہ ہندوستان میں انگریز دشمنی کا رجحان عام تھا۔ اس لئے کسی نے

بھی یہ سوال نہیں کیا کہ اگر شاہ صاحب نے جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا تو پھر ان کی زندگی میں لوگوں نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا۔ اور اگر اس فتویٰ پر عمل کو نامقصود نہ تھا تو پھر لوگ خواہ مخواہ یہ سوال پوچھ ہی کیوں رہے تھے، اس کے برعکس دارالحرب میں فریضہ جہاد و ہجرت کے مسئلہ پر بار بار زور دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر شخص تسلیم کرنے لگا کہ کسی ملک کے دارالحرب ہو جانے کا مطلب ہی یہی ہے کہ مسلمان یا تو جہاد کریں یا ہجرت، اب اگر کسی زمانے یا کسی ملک کے مسلمان اپنے اس فریضے کو ادا نہیں کرتے تو یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے، ان کی اپنی بے عملی، فریضہ کے عائد کردہ فریضہ میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی۔ کہا جاسکتا ہے کہ شریعت کے احکام کو ناپے کا پیمانہ مسلمانوں کا عمل یا ان کی بے عملی نہیں ہے۔ لیکن اس مفروضہ ہی میں کہا تک حقیقت ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیکر مسلمانان ہند پر جہاد یا ہجرت کا فریضہ عائد کیا تھا۔ وہ بھی کھل کر یہ بات نہیں کہتے کہ شاہ صاحب نے واضح الفاظ میں جہاد یا ہجرت کا حکم دیا تھا۔ بلکہ درحقیقت یہ مطلب وہ فتویٰ کے بین السطور سے نکالتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سیاسی صورت حال کے باعث شاہ صاحب کھل کر نہ تو جہاد کا حکم دے سکتے تھے اور نہ ہجرت کی تبلیغ کر سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ایک شرعی اصطلاح کا سہارا لے کر اپنے مافی الضمیر کی لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ ذاتی پسندیدگی اور سیاسی مصلحتوں سے بلند ہو کر اگر ہم اس مسئلہ پر نظر ڈالیں تو اس تشریح کی حیثیت، ایک علمی مطالبہ سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ سب سے پہلے تو ہمیں فتویٰ اور سیاسی بیان کے فرق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ ایک سیاسی لیڈر جب کوئی بیان جاری کرتا ہے۔ (خواہ وہ فتویٰ ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو) اس کے پیش نظر وقت کی سیاسی مصلحت ہوتی ہے۔ سیاسی لیڈر اس بات کا اعتدال نہیں کرتا کہ لوگ اس سے سوال کریں پھر وہ کوئی بیان دے۔ بلکہ صورت حال کا مطالعہ کر کے

خود ہی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک مفتی اس وقت فتویٰ دیتا ہے جب اس کے سامنے کسی متین مسئلہ کو پیش کر کے اس سے شریعت کا حکم معلوم کیا جاتا ہے (۱)۔ چونکہ اس دوسری قسم میں مجیب کے علاوہ سائل بھی ایک اہم کردار ہوتا ہے اس لیے اگر کسی فتویٰ میں سوال کی غرض و غایت کا پتہ چل جائے تو پھر فتویٰ کے بین السطوری مفہوم کی اہمیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔

دارالحرب کے سلسلے میں ایک بہت ہی اہم بات جو عام طور پر نظر انداز کر دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل ہو جانے کے بعد وہاں کی مسلمان آبادی پر صرف "فرائض" ہی عائد نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں چند ایسے حقوق بھی عطا کرتا ہے جو اس سے قبل مسلمانوں کو دارالاسلام میں حاصل نہیں تھے۔ مثلاً دار کی تبدیلی اگر مسلمانوں پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ دارالحرب کو دوبارہ دارالاسلام میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو دوسری طرف انہیں یہ حق بھی عطا کرتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے سودی لین دین کر سکیں جس کی انہیں پہلے اجازت نہیں تھی۔ اس کلیہ کو ذہن میں رکھ کر جب ہم شاہ صاحب کے ان تمام فتوؤں کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہندوستان کی ہیئت شرعی کے متعلق ہیں، تو یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس وقت جن لوگوں کو بھی دارالحرب کے مسئلہ سے دلچسپی تھی انہیں اپنے "فرض" سے زیادہ اپنے "حق" کی فکر تھی۔

مجموعۂ فتاویٰ عزیزی میں ہندوستان کی ہیئت شرعی سے متعلق ہمیں کئی ایک فتاویٰ ملتے ہیں۔ سب سے پہلا فتویٰ اس اصولی اور علمی سوال کے جواب میں ہے کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب میں تبدیل ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس سوال کے جواب میں شاہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ذیل باتیں دارالاسلام کو دارالحرب میں تبدیل کر دیتی ہیں۔

۱۔ دارالاسلام میں غیر مسلموں کے احکام کا جاری ہو جانا۔

۲۔ قبضہ کرنے والے دارالحرب اور مقبوضہ دارالاسلام کے درمیان کسی دوسرے دارالاسلام

کا واقع نہ ہونا۔

۳۔ امان اول کا ختم ہو جانا۔

اگر ان تینوں شرطوں کو ضروری سمجھا جائے تو پھر شاہ صاحب کے زمانے میں ہندوستان کو دارالحرب کہنا ممکن نہ تھا۔ کیوں کہ ہندوستان اور انگلینڈ کے درمیان ایک دوسرے دارالاسلام (خلافت عثمانیہ) کا وجود تھا۔ شاید اسی دشواری کے پیش نظر شاہ صاحب نے دارالحرب کے بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ درحقیقت دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں امام المسلمین کے احکام جاری و ساری ہوں۔ اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں حریوں (غیر مسلموں) کے احکام چلتے ہوں۔ اس تشریح کے مطابق ہندوستان دارالحرب تھا کیوں کہ اس وقت کے ہندوستان پر مغلوں کی نام نہاد حکومت کے باوجود سکھ، انگریزوں کا چلتا تھا، جیسا کہ اسی فتویٰ میں مذکور ہے:

”اس مشہر (دہلی) میں امام المسلمین کے بجائے عیسائی حکام کا اقتدار ہے۔ اقتدار کا مطلب یہ ہے کہ امور مملکت، ٹیکسوں کی وصولیاتی، حرموں کی سزائیں، مقدمات کے فیصلے، سب کچھ ان کی مرضی سے طے کئے جاتے ہیں۔ ہاں چند اسلامی شعائر ایسے ہیں جن سے وہ تعارض نہیں کرتے۔ مثلاً جمعہ و عیدین کی نمازیں، اذان اور قربانی وغیرہ لیکن یہ آزادی مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ عیسائیوں کی سیاسی مصلحت کی بنا پر ہے۔ کیوں کہ یہ لوگ مساجد کو بے تکلف منہدم کر دیتے ہیں اور ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کا دبدبہ اس قدر ہے کہ انکی اجازت کے بغیر کوئی بھی مسلمان یا ذمی اس شہر بلکہ اس شہر کے مضافات میں بھی داخل نہیں ہو سکتا۔ تاجروں اور اس قسم کے بے فرس مسافروں کی آمد و رفت پر انہوں نے کوئی پابندی عائد نہیں کی ہے۔ کیونکہ اس میں خود انہیں کا فائدہ ہے لیکن سیاسی حیثیت سے معروف لوگ مثلاً شجاع الملک اور دلائی بیگم (۲۴) اس شہر میں ان کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتے۔ اس شہر سے لے کر کلکتہ تک عیسائیوں کی

حکومت ہے۔ دائیں بائیں اور درمیان کی چند ریاستوں مثلاً لکھنؤ، رام پور اور حیدرآباد میں انہوں نے اپنے احکامات جاری نہیں کئے ہیں۔ کیوں کہ یہاں کے نوابوں نے ان سے معاہدے کر رکھے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر ہندوستان کو دارالحرب ہی کہنا پڑے گا۔ جیسا کہ ہمیں حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے بنی یثرب کے علاقہ کو دارالحرب قرار دے کر مانعین زکوٰۃ سے جہاد کیا تھا۔ حالانکہ وہاں اذان و نماز سب جاری تھیں...“ (۵)

مذکورہ بالا سوال و جواب سے اتنی بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لیکن استفتا اتنا مختصر ہے کہ اس سے ہمیں یہ پتہ نہیں چلتا کہ پوچھنے والے نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا۔ سوال صرف اتنا تھا کہ ایک دارالاسلام کبھی دارالحرب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کا جواب اصول فتویٰ نویسی کے مطابق ہاں یا نہیں میں ہونا چاہئے تھا۔ ہندوستان کی تفصیلی صورت حال کا تذکرہ مذکورہ بالا استفتا کے جواب میں غیر ضروری معلوم ہوتا ہے یہ خیال کیا جاسکتا ہے کہ یا تو مرتبین فتاویٰ کو سوال کا پورا متن نہیں ملا یا پھر جواب کا مذکورہ بالا ٹکڑا کسی دوسرے سوال کے جواب کا ہے۔ جسے مرتبین نے غلطی سے اس جگہ لگا دیا ہے۔ بہر حال اس سے قطع نظر کہ مذکورہ بالا ٹکڑا اسی سوال کے جواب کا حصہ ہے یا نہیں، یہ بات بلاشبہ طے ہو جاتی ہے کہ ہندوستان شاہ صاحب کی نظر میں دارالحرب تھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو ہندوستان کے دارالحرب یا دارالاسلام ہونے کی فکر تھی، انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہی کیوں تھا اور پھر یہ جان لینے کے بعد کہ ہندوستان دارالحرب ہے انہوں نے اگلا قدم کیا اٹھایا؟ اس سوال کا جواب جب تک ہمیں واضح طور پر نہ مل جائے اس وقت تک ہماری یہ بحث نامکمل رہتی ہے کہ شاہ صاحب نے ہندوستان کو دارالحرب کیوں قرار دیا تھا؟ فتاویٰ غازی میں ہمیں مختلف جگہوں پر دارالحرب اور اس سے پیدا ہونے والے مختلف مسائل سے متعلق چند اور بھی سوال و جواب ملتے ہیں۔ اس کا بھی ذکر انداز کر دیتے ہیں۔ جب

مکمل ہم ان تمام فتاویٰ کا ان کے سیاق و سباق کے ساتھ مطالعہ نہ کر لیں۔ کسی نتیجہ پر پہنچنا مشکل ہے۔ اس سلسلے کا دوسرا سوال جو ہمیں فتاویٰ عزیزی میں ملتا ہے، وہ دارالحرہ میں حربی غیر مسلموں کو سود دینے سے متعلق ہے۔ شاہ صاحب کا جواب سننے سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی معاشی حالت اس درجہ کو پہنچ چکی تھی کہ وہ اپنی غیر ضروری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے سود پر عام طور سے قرض لیا کرتے تھے۔ اس زمانے کی سماجی تاریخوں کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ سود کے شکنجے میں نہ صرف عوام بلکہ بڑے بڑے امراء حدیہ ہے کہ خود بادشاہ بھی جکڑے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ سودی قرض لینے والے مسلمانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی رہے ہوں گے جو سودی لین دین کو حرام سمجھنے کے باوجود مجبوراً سود پر قرض لیتے رہے ہوں گے اور انہیں اس کی فکر بھی رہی ہوگی کہ کسی صورت سے ان کا یہ فعل 'گناہ' کے زمرہ سے نکل جائے۔ اس گناہ سے بچنے کی سب سے بہترین صورت تو یہ تھی کہ وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرتے مگر سود پر قرض نہ لیتے۔ لیکن یہ آسان کام نہ تھا۔ زندگی میں ایسے بے شمار ناموشی مواقع آتے ہیں۔ جب عوام و خواص کی اکثریت آخرت کی جوابدہی کے مقابلے میں ہم چشموں کے طنز و تعریض کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ سود پر روپیہ قرض لے کر سماجی اور رواجی تقریبات میں اپنے کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا انہیں مواقع میں سے ایک ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسی شرعی صورت نکل آتی ہے جس کی رو سے کوئی گناہ از روئے شرع گناہ کے زمرہ سے نکل جاتا ہے۔ تو پھر ہم خدا و ہم ثواب کے پیش نظر کون اس سے واقفیت حاصل کرنا نہیں چاہے گا۔ سودی لین دین سے متعلق جو سوال اوپر نقل کیا گیا ہے وہ اس ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاہ صاحب اس نکتہ کو نہ سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن وہ ایک مفتی کی حیثیت سے اس بات پر مجبور تھے کہ سوال کا وہی جواب دیں جو فقہہ کی کتابوں میں مذکور ہو۔ خواہ اس کے اثرات سوسائٹی پر کیسے ہی پڑتے ہوں۔ چونکہ شریعت میں سود لینے اور دینے میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے شاہ صاحب نے صوف 'سود دینے' کے مسئلہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اصولی بحث

شروع کی اور کہا کہ کتب فقہ کی رو سے سود دینے اور سود لینے کا حکم یکساں ہے۔ شریعت نے دونوں کو منع کیا ہے لیکن اس ممانعت کا اطلاق دارالحرب میں رہنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان باہمی سودی لین دین پر نہیں ہوگا ... واضح رہے کہ حربوں سے دارالحرب میں سود لینا تو اس وجہ سے جائز ہے کہ ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے بشرطیکہ مال کا حصول کسی بدعہدی یا بے ایمانی کے ذریعہ نہ ہو۔ سودی لین دین میں ایک حربی چونکہ اپنی مرضی سے خوشی خوشی سود ادا کرتا ہے اس وجہ سے اس کا لینا مسلمانوں کے لئے بالکل جائز ہے دوسری طرف حربیوں کو سود دینا اس وجہ سے جائز ہے کہ سود کی حیثیت مال حرام کی سی ہے۔ اور چونکہ حربی مسلمانوں کے برضات، حرام چیزیں کھاتے ہیں اس لئے اگر انہیں سود دیا جائے تو اسکی حیثیت اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہوگی کہ انہیں مال حرام کھلایا گیا۔ اور یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ حکم دارالاسلام میں رہنے والے غیر مسلموں کے لئے نہیں ہے۔ ایسے غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان سودی لین دین ناجائز ہے۔ کیوں کہ اس طرح دارالاسلام میں سودی کاروبار ترویج پا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی اضطرابی حالت پیدا ہو جائے تو ایک مسلمان دارالاسلام میں بھی بحالت مجبوری کسی غیر مسلم سے سودی قرض لے سکتا ہے۔ (۷)

مذکورہ بالا جواب اس بات پر خاصی روشنی ڈالتا ہے کہ ۱۹ ویں صدی کے مسلمان ہندوستان کی ہدیت شرعی کو معلوم کرنے کے لئے بے حین کیوں تھے۔ بایں ہمہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا سوال ایک مسئلہ کی علی تشریح و تعبیر سے متعلق تھا اور اس کا تعلق ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے عمل سے نہیں تھا۔ مگر یہ مفروضہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے، جب ہم اگلے سوال و جواب پر نظر ڈالتے ہیں۔ اس استفتاء میں حسب ذیل سوالات پوچھے گئے تھے۔

۱۔ ہندوستان کے وہ علاقے جو عیسائیوں کے قبضہ میں ہیں دارالحرب ہیں یا دارالاسلام؟ اگر یہ علاقے دارالحرب ہیں تو کیا یہاں کے مسلمان عیسائیوں سے سود لے سکتے ہیں؟

۲۔ کیا دارالحرب میں جمعہ کی نماز پڑھ لینے سے ظلم کے ساقط ہو جاتی ہے؟ (۸)

۳۔ کیا بوقت ضرورت مسلمان غیر مسلموں سے سودی لین دین کر سکتے ہیں؟

ان سوالات کے جواب میں شاہ صاحب نے یہ اصولی بات بتائی کہ کسی ملک کے دارالحرب ہونے کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ ان کا مطالعہ کرنا چاہیے، اور دیکھنا چاہیے کہ وہ صورتیں عیسائیوں کے مقبوضہ علاقوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ اگر وہ صورتیں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ علاقے دارالحرب ہوں گے۔ اور مسلمانوں اور حرمیوں کے درمیان سودی لین دین اذروے شرع جائز ہوگا۔ بہر حال مسلمانوں کو یہ چاہئے کہ وہ غیر مسلموں کو سود دینے میں احتیاط برتیں۔ اور بے ضرورت سود نہ دیں۔

اقامت جمعہ کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر کسی دارالحرب کے والی نے اپنی طرف سے کسی شہر میں مسلمان حاکم مقرر کر دیا ہے تو اس مسلمان حاکم کی اجازت سے جمعہ قائم کیا جائے گا۔ لیکن اگر ایسی صورت موجود نہ ہو تو پھر مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ باہمی مشورہ سے کسی امین ائمہ دین شخص کو اپنا رئیس (امام) مقرر کر لیں اور اس کی اجازت سے شرعی امور مثلاً اقامت جمعہ و عیدین اور بے والی وارثوں وغیرہ کے نکاح کا انتظام کیا کریں۔ لیکن واضح رہے کہ یہ امام صرف شرعی معاملہ پر نظر رکھے گا۔ ملک کی سیاسیات سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو پھر مناسب یہ ہے کہ مسلمان جمعہ کی نماز ادا کرنے کے بعد احتیاطاً چار رکعت نماز ظہر کی بھی پڑھ لیا کریں۔ تاکہ اگر جمعہ کی نماز سے فرضیت ادا نہیں ہوئی ہے تو پھر ان چاروں رکعت سے ظہر کی فرضیت ادا ہو جائے۔

سوال کی تیسری شق کے متعلق شاہ صاحب نے دارالحرب کی تشریح کرتے ہوئے کہا کہ سودی لین دین جائز ہے۔ (۹)

ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے یہ جوابات آپ کے ہم عمروں کے علم میں ضرور آئے ہونگے۔ اور ان میں کچھ لوگ ایسے بھی رہے ہوں گے جنہیں یہ اندیشہ رہا ہوگا کہ اگر ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں باہمی سودی لین دین کی کھلی چھٹی دے دی گئی تو پھر

مسلمانوں میں سود کے خلاف تھوڑی بہت جو جھجک باقی رہ گئی ہے وہ بھی ختم ہو جائے گی۔ حسب ذیل سوال اسی فرضیت کی غمازی کرتا ہے۔ اگرچہ سوال کرنے والے کا نام نہیں معلوم۔ لیکن عبارت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سائنس کی نظر مسائل فقہیہ پر اچھی خاصی ہے اور سوال کے پردہ میں وہ شاہ صاحب کے خیالات پر اعتراض کر رہا ہے۔ سوال یہ ہے:

”ہدایہ میں لکھا ہوا ہے کہ امام ابو حنیفہ نے دار الحرب میں غیر مسلموں سے سود لینا جائز قرار دیا ہے۔ لیکن امام ابو یوسف، امام محمد اور امام شافعی اس رائے کے خلاف ہیں۔ قرآن و حدیث میں بھی سود کے بارے میں جو احکام مذکور ہیں ان کو دیکھتے ہوئے سید کا جواز (دار الحرب میں بھی) مستبعد العقل معلوم ہوتا ہے۔ اور ہاں کیا آپ انگریزوں کے علاقوں کو بھی دار الحرب سمجھتے ہیں؟“ (۱۰)

اس سوال کے جواب میں بھی شاہ صاحب نے اپنے موقف میں تبدیلی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ سود کے مسائل بہت پیچیدہ ہیں، مختصر آئیہ سمجھنا چاہیے کہ دار الحرب میں مسلمان کے لئے یہ تو جائز نہیں ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مال پر زبردستی قبضہ کر لے لیکن اگر کوئی غیر مسلم اپنی خوشی سے کچھ دے تو اس کا لینا جائز ہے خواہ یہ ادائیگی کسی شرط قاسدہ کی تحت کیوں نہ ہو رہی ہو۔ رہ گئی یہ بات کہ انگریزی علاقے دار الحرب ہیں یا نہیں اس کا پتہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لیجئے کہ حالات کی تبدیلی سے ایک دارالاسلام دار الحرب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تبدیلی لانے والے حالات کے تعین میں اختلاف ملے ہے۔ کچھ فقہاء کا خیال ہے کہ شعائر اسلام میں سے اگر ایک شعار میں بھی تبدیلی آجائے تو دار کی حیثیت بدل جاتی ہے۔ مثلاً حکماً اذان اور نماز بند کر دی جائے یا حقنہ ممنوع قرار دے دیا جائے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ دار کی تبدیلی صرف شعائر اسلام کے محو ہو جانے پر موقوف نہیں ہے۔ بلکہ اگر تمام شعائر کی اجازت کے باوجود دارالاسلام میں شعائر کفر کھلم کھلا رواج پا جائیں اور مسلمانوں کو ان کے روکنے پر قدرت حاصل نہ ہو تو

پھر ایسا دارالاسلام دارالحرب ہو جاتا ہے، تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ دارالاسلام صرف اس وقت دارالحرب ہو جاتا ہے جب وہاں کوئی مسلمان یا ذمی امان اول پر باقی نہ رہ جائے، خواہ شاعر اسلام ترک ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، اور خواہ شاعر کفر کا ہاج ہو یا نہ ہو۔ اس تیسرے رائے کو محققین اور اہل علم صحیح سمجھتے ہیں۔ اور اس کے مطابق انگریزی علاقے بلاشبہ دارالحرب ہیں۔ (۱۲)

حاصل مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کے مجموعہ فتاویٰ میں ہمیں جتنے بھی سوالات دارالحرب سے متعلق ملتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک سوال بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ پوچھنے والے کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر ہندوستان جو اس وقت تک کم از کم نظری طور پر دارالاسلام تھا۔ دارالحرب ہو گیا ہے تو پھر اسے سابقہ حالت پر لانے کے لئے مسلمانوں کو کیا کرنا ہو گا۔ اس کے برعکس ہر سوال اس وقت مسلمانوں کی معاشی اور سماجی حالت کی غمازی کرتا ہے۔ خواہ ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو یا نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ سودی لین دین اس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں گہری جڑ پکڑ چکا تھا۔ معاملہ صرف مسلمانوں اور غیر مسلموں تک محدود نہ تھا۔ بلکہ فتاویٰ غازی میں شاہ صاحب کا ایک ایسا بیان بھی ملتا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خود مسلمان یا ہم ایک دوسرے سے سودی لین دین کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل بیان جو کسی سوال کے جواب میں نہیں، بلکہ ایک مسئلہ کی حیثیت سے مجموعہ فتاویٰ میں مذکور ہے۔ اس معاملہ پر خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ شاہ صاحب کے قول کے مطابق ”احادیث کی رو سے سودی لین دین قطعاً حرام ہے، سوائے اس کے کہ کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے،“ ایسے مواقع پر قانون استثنائی پر عمل ہو گا، جیسا کہ قرآن نے اشد ضرورت کے موقع پر مہر دار کا کھال لینا بھی جائز قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کسی جگہ سودی لین دین عام ہو جائے جس طرح کہ ہندوستان میں ہے، تو وہاں پر اس ناجائز کام کو قانون عموم بلوی (۱۳) کے تحت جائز قرار نہیں دیا جائے گا۔ کیونکہ عموم بلوی کا قانون طہارہ و نجاست کے مسئلہ پر مشتمل ہے۔ اس قانون کی رو

سے حرام کو حلال یا حلال کو حرام نہیں قرار دیا جاسکتا۔ (۱۴)

مذکورہ بالا بیان میں اگرچہ یہ واضح طور سے نہیں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں باہم سودی لین دین عام ہو گیا تھا۔ لیکن اگر ہم کچھ تئوں کو ذہن میں رکھیں تو پھر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ یہ عبارت ایسے موقع کے لئے ہے جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہیں۔ ورنہ جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کا مسئلہ تھا، اسے تو شاہ صاحب نے وضاحت کے ساتھ بتا دیا تھا کہ ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کے باعث اس میں کوئی قباحت نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن یہاں پر جو لوگ عموم بلوی کی آڑ لے کر سودی لین دین کو جائز قرار دینا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب اسے غلط قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عموم بلوی کی آڑ انہیں مسائل میں لی گئی ہوگی جہاں دونوں پارٹیاں مسلمان ہوں گی۔ یہ صرف ایک خیال ہی نہیں ہے کہ مسلمان باہم بھی سودی لین دین کرتے تھے۔ بلکہ ہمیں چند اور ایسے ہی سوالات مجموعہ فتاویٰ میں ملتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے بعض مسلمانوں کو یہ ڈر تھا کہ اگر دارالحرب کے مسئلہ کی بنا پر مسلمانوں اور غیر مسلموں میں سودی لین دین کو جائز ٹھہرایا گیا تو ایک نہ ایک دن مسلمان خود ایک دوسرے سے کھلم کھلا سودی لین دین شروع کر دیں گے۔ ان خطوط پر سوچنے والے یہ چاہتے تھے کہ سود کو بالکل حرام سمجھا جائے، لیکن شاہ صاحب نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر اس طرح اندیشہ فردا کے تحت ہر مسئلہ کو حل کیا جائے گا تو پھر جہاد کو بھی ممنوع قرار دینا پڑے گا۔ کیوں کہ جہاد میں بظاہر تباہی و بربادی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے علاوہ اور کیا ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن اگر مسلمانوں میں جنگ جوئی کی عادت باقی رہی تو اگر وہ کبھی غیر مسلموں کو نہ پائیں گے تو خود باہم ایک دوسرے سے جنگ و جدال شروع کر دیں گے۔ یہ کہنے کے بعد شاہ صاحب بوجھتے ہیں کہ کیا اس اندیشہ کی وجہ سے جہاد کو ناجائز قرار

دے دیا جائے؟ (۱۵)

ادپر کے صفحات میں دارالحرب میں سودی لین دین کے جواز کے سلسلے میں جو سوالات و جوابات پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ مطلب نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ شاہ صاحب یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سے سودی لین دین کو حرام کے درجہ سے نکال کر حلال قرار دیں۔ درحقیقت یہ مسئلہ جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اس زمانے کے حالات کی پیداوار تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے قبل جب تک مسلمانوں کی مضبوط حکومت قائم رہی اور کم از کم نظری طور حکومت یا اہل حکومت کا مذہب اسلام رہا۔ اس وقت تک عوام یہ سمجھتے رہے کہ ان کی معاشی ذمہ داریاں حکومت کے سر ہیں۔ درمعاش، جاگیرات اور اسی قسم کے دوسرے وظائف سے حکومت لوگوں کی مدد کرتی رہتی تھی۔ لیکن نظام حکومت کے بدل جانے کے بعد ہر شخص کی معاشی ذمہ داری اس کے اپنے سر آئی۔ خرچ کے سلسلے میں بگڑی ہوئی عادتوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ آسان صورت یہی رہ جاتی تھی کہ مستقبل کا خیال کئے بغیر حال کی ذمہ داریوں کو سودی قرض لے کر یا غیر مسلم حکومت سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر کے پوری کی جائیں۔ اور اس سلسلے میں شریعت کی طرف سے اگر کوئی رکاوٹ پڑتی ہو تو اسے شریعت کی رو سے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ رویہ بظاہر خواہ کتنا ہی محبوب ہو۔۔۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب کسی بھی مذہب کی شریعت ایک "قانون" کا درجہ حاصل کر لیتی ہے تو پھر ایک نہ ایک دن اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ یہ رجحان ہمیں صرف ۱۹ ویں صدی کے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ماضی میں بھی نظر آتا ہے فقہ کی ہر اہم کتاب میں "حیلوں" کا ایک باب بھی ہوتا ہے جن میں وہ صورتیں درج ہوتی ہیں جن پر عمل کر کے ایک شخص بظاہر شریعت کی روح کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی شریعت کی پابندی کرتا رہتا ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لئے مجموعہ فتاویٰ عمریزی سے صرف ایک مثال پیش کرینی کافی ہوگی۔

ہنڈی یا آج کل کی اصطلاح میں بینک ڈرافٹ کے ذریعہ روپیہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا جو طریقہ ہے اس سے شاید ہی کوئی پڑھا لکھا شخص ناواقف ہو۔ شاہ صاحب سے

جب اس طریق کار کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اسے ناجائز قرار دیا۔ کیوں کہ شریعت کی رو سے ہم جنس اشیا کا تبادلہ کمی بیشی کے ساتھ نہیں ہو سکتا لیکن اگر جنس بدل جائے تو پھر ہر قسم کی کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر چاول کے بدلے سو سیر چاول نہ تولے جاسکتے ہیں اور نہ دے جاسکتے ہیں۔ لیکن اسی ایک سیر چاول کا تبادلہ من دو من گہوں سے ہو سکتا ہے کیوں کہ چاول اور گہوں مختلف الجنس ہیں۔ اس طرح ایک جگہ زائد روپے دے کر دوسری جگہ کم روپے نہیں لئے جاسکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص یا ادارہ ہنڈی کا کام کرتا ہے۔ وہ حق المحنت کے نام سے کچھ زیادہ روپیہ ادا کرتا ہے۔ زبان سے اس طریقہ کو ناجائز قرار دیدینا تو آسان ہے۔ لیکن عملی زندگی میں اس کے بغیر چارہ بھی نہیں ہے۔ یا تو پوری قوم کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ گناہ کا ارتکاب کرتی رہے۔ یا پھر کوئی ایسی صورت نکالی جائے جس سے گناہ گناہ نہ رہے۔ اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے شاہ صاحب نے ہنڈی کو جائز کر لینے کی ترکیب ”طریق حلال کردن این وبا...“ (بھی بتادی۔ آپ نے کہا کہ ہنڈی کی ممانعت صرف اس وجہ سے ہے کہ روپے کی جنس ایک ہے، اس لئے اس کے تبادلہ میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ لیکن روپوں کے ساتھ اگر کچھ ریزگاری بھی دی جائے اور اس کے بدلے صرف روپے لئے جائیں تو چوں کہ روپے اور ریزگاریاں مختلف الجنس ہیں اس لئے ان کے تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہو جائیگی۔^(۱۶)

یہ مثال جملہ معترضہ کے طور پر یہاں آگئی ہے اور اس کے بیان کرنے کا مقصد اگر ایک طرف یہ دکھانا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ۱۹ویں صدی کی ابتدا میں ایک نئے نظام سے روشناس ہو رہے تھے اور ایک ایسی رہنمائی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو ان میں شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے نئے حالات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرے۔ تو دوسری طرف یہ سوالات ہیں ان مسائل کے سمجھنے میں بھی مدد دیتے ہیں۔ جن سے اس وقت کے مسلمان دوچار ہو رہے تھے۔ سودی لین دین کے علاوہ دوسرے اہم مسائل جو اس وقت مسلمانوں کو درپیش تھے وہ بظاہر سیاسی لیکن درحقیقت معاشی تھے۔ قرآن کی آیت **وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ** دگناہوں اور رائیوں

میں تم شریک کار نہ بنو) کی موجودگی میں اکثر مسلمانوں کو..... یہ خیال آتا ہے کہ اگر وہ
انگریزوں سے تعاون نہ کریں کیوں کہ ان کی وجہ سے دارالاسلام کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ لیکن دشواری
یہ تھی کہ اگر وہ تعاون نہ کرتے تو کھاتے کہاں سے کہنے کو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ زندہ رہنے کیلئے
انگریزوں سے تعاون کرنا کچھ ضروری نہیں تھا کیوں کہ مسلمان آزادانہ طور سے صنعت و حرفت
کے پیشے کو اختیار کر سکتے تھے۔ لیکن اس قسم کی بات درحقیقت وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے مسلم
سماج کا گہرا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ مسلمانوں نے ہمیشہ ملازمت کو ذریعہ افتخار سمجھا ہے اور زراعت
و تجارت وغیرہ کو دوسرے درجہ پر جگہ دی ہے۔ ۱۹ویں صدی کی پہلی دہائی میں بھی یہی ذہنیت
ہندوستانی مسلم سماج میں کارفرما تھی۔ ۱۲۲۹ھ یعنی ۱۸۱۳ء میں پوچھے گئے اس سوال کے
جواب میں کہ حلال روزی کس طرح حاصل کی جاسکتی ہے۔ شاہ صاحب نے ذرائع معاش کو چار
درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ملازمت سب سے اوپر ہے اس کے بعد زراعت پھر تجارت
ہے۔ اور سب سے نیچے صنعت و حرفت ہے (۱۷) ظاہر ہے کہ جس سماج کے معاشی ڈھانچہ میں
ملازمت اور زراعت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو وہ سماج حکومت سے عدم تعاون کس
طرح کر سکتا ہے۔ اس لئے شاہ صاحب کے سامنے جب بھی یہ سوال رکھا گیا کہ مسلمان انگریزوں کی
ملازمت کریں یا نہ کریں؟ تو ہر بلاکپ نے یہی کہا کہ انگریزوں کی ملازمت جائز ہے بشرطیکہ اس
ملازمت میں غلامت شرع کوئی کام نہ کرنا پڑے (۱۸) ظاہر ہے کہ یہ شرط انگریزوں کے ساتھ مخصوص
نہیں کی جاسکتی کیوں کہ کسی بھی ملازمت میں اگر غلامت شرع کوئی کام نہ کرنا پڑے تو وہ ملازمت
جائز ہوگی۔ خواہ ملازمت دینے والا مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔ نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب نے ملازمت
کے جواز کا فتویٰ دیا بلکہ جب خود آپ کے بیٹے اور داماد مولانا عبدالحی کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف
لے جرح کے مفتی کا عہدہ پیش کیا گیا تو شاہ صاحب نے انہیں ملازمت قبول کر لینے کی اجازت
نہی دے دی۔ آپ کے اس فیصلہ کو اس وقت کے مشہور نقشبندی صوفی شاہ غلام علی نے پسند
نہ کیا اور شاہ عبدالعزیز کے نام کے خط میں لکھا کہ انگریزوں کی ملازمت سے رزق حاصل کرنا

کی بجائے مولانا عبدالحی کو چاہیے کہ وہ فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کریں لیکن شاہ صاحب نے اس خط کے جواب میں اپنے خیالات کو بہت ہی تفصیل سے پیش کرتے ہوئے اپنے اور مولانا عبدالحی کے طرز عمل کو شریعت کی نظروں میں بہتر اور پسندیدہ ثابت کیا۔ (۱۹)

ملازمت پیشہ مسلمانوں کے برخلاف زراعت پیشہ مسلمان دہری مشکلات سے دوچار تھے انگریزوں کے اقتدار کے بعد زراعت کے لئے زمینیں انگریزوں ہی کے ذریعہ مل سکتی تھیں۔ اور یہ زمینیں وہی تھیں جو انگریزوں نے مسلمان بادشاہ یا مسلمان زمین داروں سے چھینی تھیں۔ اب اگر ان چھینی ہوئی زمینوں کو مسلمان انگریزوں سے لے کر کاشت کرتے تو سب سے پہلے انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت تھی کہ ان کا یہ فعل "تعاون علی الاثم والعدوان" کے زمرہ میں نہیں آتا اور دوسری طرف اس خدشہ کو بھی دور کرنا تھا کہ اب جن (انگریز) بادشاہوں سے وہ زمین حاصل کر رہے ہیں دارالاسلام پر ان کا قبضہ شرعاً تسلیم کر لیا گیا ہے۔ کیوں کہ ان کا قبضہ اگر عند الشرع نہ ہو تو اس بات کا پورا امکان تھا کہ انگریزوں کے کسی وقت بھی ملک سے چلے جانے کے بعد سابقہ مالکان از روئے شرع زمینوں کے دعویدار ہو جائیں گے۔ اس اندیشہ کی وجہ یہ تھی کہ بعض فقہاء کے خیال میں دارالاسلام ہمیشہ دارالاسلام ہی رہتا ہے اور اگر کبھی اس پر جرمیوں کا قبضہ ہو بھی جائے تو اس کیفیت کو عارضی سمجھا جائے گا۔ اگر اس فتویٰ پر عمل کیا جاتا تو پھر ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ اور ان سے کئے ہوئے ہر قسم کے معاہدات از روئے شرع عارضی ہوتے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ ایک زراعت پیشہ شخص انگریزوں سے حاصل کی ہوئی زمین پر محنت اور سرمایہ لگانے سے ہچکچاتا، کیوں کہ اس کو اپنی ملکیت کا اطمینان نہ ہوتا۔ شاہ صاحب نے زمینوں کے مسئلہ کو اسی نقطہ نظر سے دیکھا۔ اسی لئے جب ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ خیال بے بنیاد ہے کہ ایک دارالاسلام دارالحرب نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی ممکن ہے، کیونکہ جب کبھی بھی حربی کسی دارالاسلام پر اس طرح قابض ہو جائیں کہ مسلمان اپنی سیاسی قوت کھودیں، تو وہ ملک دارالحرب ہو جاتا ہے۔ شریعت جرمیوں کے قبضہ کو تسلیم کرتی ہے اور انہیں یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی

رعایا سے جس قسم کے معاہدات چاہیں کریں۔ اس نظریہ کے مطابق ہندوستان کی آرضیات پر انگریزوں کا قبضہ عارضی نہیں کہا جاسکتا۔ اس لئے جو لوگ ہندوستانیوں کی ضبط شدہ آرضیات انگریزوں سے قیمتی یا تحفظاً قبول کر کے اپنے تصرف میں لائیں گے، وہی لوگ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی شرعاً مالک شمار ہوں گے۔ پرلے مالکان ان زمینوں کو واپس لینے کے مجاز نہ ہوں گے۔ (۲۰)

یہ صحیح ہے کہ مجموعہ فتاویٰ میں ایسا کوئی سوال نہیں ملتا، جس میں یہ پوچھا گیا ہو کہ ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کے بعد مسلمانوں پر ہجرت یا جہاد کا فریضہ عائد ہوتا ہے یا نہیں لیکن ہمیں ایسے اشارات فرور ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ ہندوستان کے دارالحرب ہو جانے کے بعد وہاں سے ہجرت کر جانا ضروری تھا، ہمیں اسکی شہادت تو نہیں ملتی کہ شاہ صاحب کی زندگی میں کسی بھی عالم نے ہجرت کے مسئلہ پر عمل کرتے ہوئے اجماعاً، ہجرت کی کوئی تحریک چلائی ہو، لیکن مجموعہ فتاویٰ عربی میں ہمیں کسی شخص کا ایک اعتراض شاہ صاحب کے اس طرز عمل پر ملتا ہے کہ وہ ہندوستان کو دارالحرب سمجھتے ہوئے بھی وہاں قیام پذیر تھے۔ یہ طرز عمل معترض کی نظروں میں خلافت شریعت تھا۔ شاہ صاحب نے اس اعتراض کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ آپ کے خیال میں اس دارالحرب سے ہجرت فرض تھی۔ جہاں مسلمانوں کو اپنے شعائر دینی ادا کرنے کی ممانعت ہو۔ ہندوستان میں مسلمان چون کہ اپنے شعائر دینی مثلاً اذان، نماز قربانی وغیرہ کی ادائیگی میں آزاد تھے۔ اس لئے ہندوستان دارالحرب ہوتے ہوئے بھی اس ذمہ میں نہیں آتا تھا جہاں سے ہجرت کرنی ضروری ہوتی۔ (۲۱) یہاں یہ بات فروز ذہن میں رہنی چاہئے کہ شاہ صاحب دارالحرب سے ہجرت اس وقت تک ضروری قرار نہیں دیتے جب تک کہ شعائر مذہبی کو ادا کرنا حکومت کی طرف سے باقاعدہ ممنوع قرار نہ دے دیا گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ "مانعت" کا عدم "قدرت" کے مترادف نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی حکومت اپنی بے تعمیری اور سیاسی مسئلوں کے پیش نظر مسلمانوں کے شعائر دینی میں دخل اندازی نہ کرے، لیکن اگر مسلمانوں میں سیاسی قوت نہیں ہے

رہ گئی جہاد کی بات تو مجموعہ فتاویٰ میں، میں اس موضوع پر کوئی سوال نہیں ملتا۔ نہ تو اس
 سلسلے میں کسی نے آپ سے فتویٰ طلب کیا، نہ کسی نے آپ پر اعتراض کیا کہ ہندوستان کو دارالکرب
 سمجھنے کے بعد آپ جہاد کیوں نہیں کرتے۔ ہاں ایک موقع پر قرآن آیت "وجاہدوا فی
 سبیل اللہ" کی تشریح کرتے ہوئے شاہ صاحب نے جہاد کی جو تعریف کی ہے وہ بعینہ
 وہی ہے جسے ختم ۱۹ ویں صدی میں سرسید، امیر علی، اور چرآن علی وغیرہ نے اختیار کیا تھا۔ شاہ
 صاحب کے خیال میں "جہاد کی تین قسمیں ہیں۔ قسم اول جہاد زبانی ہے۔ اس جہاد کو وعظ و نصیحت
 ترغیب و ترہیب اور رفع شبہات مخالفین کے ذریعہ ادا کیا جاتا ہے۔ دوسرے نمبر پر وہ جہاد
 ہے جس میں مسلمان اس خیال سے جنگی تیاری کرتے ہیں کہ اگر حقیقتاً جنگ کا موقع آگیا تو پھر
 انہیں شکست نہ ہو۔ تیسرے نمبر پر وہ جہاد ہے جس میں عداوت بدست جنگ

ہوتی ہے جہاد کی ان تینوں قسموں پر تفصیلی روشنی دلانے کے بعد شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”بلاشبہ اُن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پہلی دو قسموں کے جہاد میں مشغول تھے۔ قسم سوم میں جو درحقیقت سب سے ادنیٰ جہاد ہے، اُن حضرت نے شرکت نہیں کی۔“ (۲۳)

مذکورہ بالا بحث کے بعد ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ کم از کم شاہ صاحب یا ان کے ہم عصر مسلمان، دارالحرب کے مسئلہ کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے، جس نقطہ نظر سے ہم چاہتے ہیں کہ وہ دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بدلتی ہوئی صورت حال نے اس وقت کے مسلمانوں کے سامنے چند اہم معاشی مسائل لاکھڑے کئے تھے۔ اور وہ ان مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے بے چین تھے۔ دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث میں ایک موقف تو وہ تھا جسے شاہ صاحب نے اختیار کیا۔ اور دوسرا موقف یہ ہو سکتا تھا کہ آپ ہر سوال کرنے والے کو یہ جواب دیتے کہ ہاں ہندوستان دارالحرب تو ہو گیا ہے لیکن تم سود کا جواز معلوم کرنے کے بجائے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ ہندوستان کو پھر سے دارالاسلام کس طرح بنایا جاسکتا ہے۔ شاہ صاحب یہ جواب دے سکتے تھے لیکن اگر وہ ایسا کرتے تو درحقیقت ماہر قانون شریعت (منفی) کے موقف سے ہٹ چکے ہوتے کیوں کہ قانون شریعت کے ماہر ہونے کے باعث اگر ایک طرف ان کا یہ فریضہ تھا کہ وہ شریعت کی حد میں رہتے ہوئے مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کریں تو دوسری طرف تادم بخ دیں پر نگہ بنی نظر ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے جوابات سے مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات بھی اٹھانی تھی کہ قانون شریعت جامد نہیں، بلکہ لچکدار اور زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس لئے ان قوانین پر زمان و مکان کی تبدیلیوں کا اثر بھی ناگزیر ہے۔

حوالجات

- ۱۔ اس فرق کی ایک بہترین مثال ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے جاری کردہ فتاویٰ سے ہجرت میں نظر آتی ہے جسے انہوں نے کسی استنباط کے بغیر ۱۹۰۲ء میں جاری کیا تھا۔ فتویٰ میں مولانا آزاد

نے مسلمانوں پر ہندوستان سے ہجرت ضروری قرار دی تھی۔ چوں کہ مولانا نے وہ فتویٰ کسی شخص کے سوال کے جواب میں نہیں دیا تھا اس لئے ہم اس فتویٰ کے ظاہری یا معنوی معنی نکالنے میں آزاد ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہجرت کرنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔ لیکن چوں کہ مولانا اس وقت کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر ہندوستان سے ہجرت ضروری سمجھتے تھے اس لئے انہوں نے ایمان داری کے ساتھ اپنی رائے عوام کے سامنے پیش کر دی تھی۔ لیکن اگر یہی فتویٰ کسی شخص کے استفتاء کے جواب میں ہوتا تو پھر یہ کہا جاتا کہ اس زمانے میں مولانا آزاد کے علاوہ بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جن کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ آیا ہندوستان سے ہجرت کر جانی چاہئے یا نہیں۔ (مولانا آزاد کے فتوے ہجرت کے تن کے لئے ملاحظہ ہو تہذکات آزاد "مرتبہ غلام رسول مہر کتاب منزل، لاہور۔ ۱۹۵۹، صفحات ۲۰۳ مسلسل اس سے قبل یہ فتویٰ ہفت روزہ اہل حدیث امرت سر کی اشاعت ۳۰ جولائی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔)

۲۔ ابتدائی ۱۴ ویں صدی ہجری (آخر ۱۹ ویں صدی عیسوی) میں مطبع مجتبائی دہلی کے مالک مولوی عبدالاحد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ شاہ صاحب کے جتنے بھی فتاویٰ دستیاب ہو سکیں، انہیں ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ انہوں نے تمام فتاویٰ کو جمع کرایا اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء کی تصحیح کے بعد انہیں دو جلدوں میں اپنے ہی مطبع سے مجموعہ فتاویٰ عنریزی (فارسی) کے نام سے شائع کر دیا۔ پہلی جلد ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) اور دوسری جلد ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۶ء) میں شائع ہوئی۔ ان دونوں جلدوں میں شاہ صاحب کی ہر وہ تحریر جو مرتبین کی نظروں میں "فتویٰ" معلوم ہوئی جمع کر دی گئی۔ مثلاً انہیں صفیات میں شاہ صاحب کے بیان کردہ بہت سارے تفسیری نکات اور چنانچہ ایک ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جو انہوں نے اپنے دوستوں، شاگردوں اور ہم عصروں کو کسی علمی مسئلے پر لکھے تھے۔ دونوں جلدوں کے شروع میں ایک مجمل سی فہرست مضامین بھی ہے۔ لیکن درحقیقت کتاب کی ترتیب میں کسی قسم کا بھی اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ اصل فارسی کتاب کا اردو ترجمہ بھی

۳۔ ”امان اول“ سے وہ معاہدات مراد ہیں جو دارالاسلام اور اس کے مسلمان اور غیر مسلم شہریوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

۴۔ مضمون نگار نے اپنی سسی پوری کوشش کی لیکن اسے ان دونوں شخصیتوں کے حالات کہیں دستیاب نہ ہو سکے۔

۵۔ ملاحظہ ہو مجموعہ فتاویٰ عزیزی دائرہ صرف فتاویٰ لکھا جائے گا از شاہ عبدالعزیز دہلوی (فارسی) جلد اول ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۳ء) صفحات ۱۷۷، ۱۸۱۔

۶۔ ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۱۲

۷۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۲۸۔

۸۔ بظاہر سائل ظہر کی فرضیت کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے سوال کا پس منظر یہ ہے کہ جمعہ کی امامت اصلاً خلیفہ کی ذمہ داری ہے۔ اگر وہ خود امامت نہ کر سکے اور ظاہر ہے کہ وہ بیک وقت مختلف جگہوں پر امامت نہیں کر سکتا۔ تو پھر اس کا مقرر کردہ امام اس فرض کو ادا کرے گا۔ دارالحرب میں چوں کہ خلیفہ عزل و نصب کا اختیار نہیں رکھتا اس لئے امام جامع مسجد بھی درحقیقت خلیفہ کی نیابت نہیں کرتا، اس دشواری کی وجہ سے اکثر فقہائے نزدیک دارالحرب میں جمعہ کی نماز ادا نہیں کی جائے گی۔ بلکہ عام دنوں کی طرح ظہر کی نماز پڑھی جائے گی۔ اب اگر اس کے باوجود کسی دارالحرب میں مسلمان جمعہ کی نماز پڑھتے ہیں، جو بظاہر ان پر فرض نہیں ہے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آیا وہ پھر سے ظہر کی نماز پڑھیں یا جمعہ ہی کی نماز کو کافی سمجھیں۔ اگر دیکھا جائے تو اس سوال میں بھی وہی حصول حق کی ذہنیت کام کر رہی ہے۔ ظہر کی نماز کے مقابلہ میں جمعہ کی نماز زیادہ اہتمام چاہتی ہے۔ ظہر کی جماعت اگر چھوٹ جائے تو آدمی اسے تنہا بھی پڑھ سکتا ہے۔ لیکن جمعہ کی جماعت اگر ایک مسجد میں نہ ملے تو دوسری کارخ کو ناپڑتا ہے۔ جمعہ کی نماز میں جماعت اور خطبہ چھوٹ جانے کے ڈر سے وقت سے بہت پہلے مسجد میں آکر بیٹھنا پڑتا ہے، لیکن اگر جمعہ کی فرضیت ختم ہو جاتی ہے تو دکان اور کاروبار کو بند کر کے جامع مسجد میں آنے کی چھٹی

مل جاتی ہے۔ اور اپنے پڑوس کی مسجد یا گھر یا دکان ہی پر ظہر کا فریضہ ادا کیا جاسکتا ہے۔

۹۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۳۳، ۳۴

۱۰۔ ” ص ۱۱۵

۱۱ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو گزشتہ حاشیہ نمبر ۳

۱۲۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۱۱۵، ۱۱۶ (مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس سے قبل متن حاشیہ

نمبر ۶ کی جس عبارت کے بارے میں یہ شبہ ظاہر کیا گیا تھا کہ وہ کسی دوسری جگہ سے تعلق رکھتا ہے

وہ ٹکڑا اس فتویٰ کا ایک حصہ ہے۔ اس سوال میں خاص طور سے انگریزی علاقوں کے بارے میں

پوچھا گیا ہے اور شاہ صاحب نے ان علاقوں کو ”امان اول“ کے معدوم ہو جانے کے باعث دارالحرب

قرار دیا ہے۔ اگر ”اس شہر دہلی میں...“ والا ٹکڑا ہم اس جواب کے ساتھ ملا کر پڑھیں تو یہ معلوم ہوگا

کہ دہلی سے لے کر کلکتہ تک کے سیاسی حالات کا تجزیہ دراصل ”امان اول“ کی عدمیست کی تفصیل میں ہے۔

۱۳۔ عوم بلوئی اس مرگ انوہ کو کہتے ہیں۔ جس سے ایک بہت بڑا گروہ مستقل طور سے دو

چار رہتا ہو، مثلاً نماز پڑھنے کے لئے کپڑوں کا پاک ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ کپڑے

پر نجاست لگ گئی ہے تو اسے صاف کرنا ضروری ہوگا۔ لیکن ایسے لوگ جن کا کاروبار ہی اس قسم

کا ہو کہ انہیں ہر وقت گوہر اور غلاظت سے واسطہ پڑتا ہو تو ان کے لئے یہ اجازت ہے کہ وہ جب تک

اپنے کپڑوں پر نجاست نہ دیکھ لیں اس وقت تک اپنے کپڑوں کو صاف سمجھیں۔

۱۴۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۱۲۹

۱۵۔ ” ص ۱۱۶

۱۶۔ ” ص ۳۲ اس مثال سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ شاہ صاحب

ایک حرام شے کو جانتے بوجھتے حلال ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کیوں کہ اس قسم کی کوشش

شاہ صاحب کے نزدیک مباحاً گنہگار ہے اور ایسا شخص جو محض اتباع نفس کی خاطر حلال کو حرام یا

اکتوبر ۱۹۶۹ء

۲۴۳

حرام کو حلال سمجھنا ہو کافر ہے۔“ (ملاحظہ ہو فتاویٰ جلد ۱، ص ۱۵۶) درحقیقت شاہ صاحب نے ہندی کے مسئلہ میں جو رائے دی ہے وہ اس سماج کے طریق فکر کی عکاسی کر رہی ہے جہاں شریعت اور قانون میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ دائرہ قانون میں رہتے ہوئے قانونی شکنجوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔

۱۷۔ شاہ عبدالعزیز، مجموعہ رسائل خمسہ (مجموعہ فتاویٰ عزیزی جلد اول کے ساتھ مطبوعہ)

صفحہ ۱۸۵۔

۱۸۔ فتاویٰ جلد ۱، صفحات ۱۱۳، ۱۹۵، ۱۹۶، جلد ۲ ص ۱۱۹

۱۹۔ فتاویٰ جلد ۱، ص ۹۱۔

۲۰۔ ایضاً جلد ۱، صفحات ۱۶۲، ۱۶۳

۲۱۔ ایضاً جلد ۱ ص ۵۲

۲۲۔ ایضاً جلد ۱ ص ۱۶۳

۲۳۔ فتاویٰ جلد دوم ص ۸۸

تاریخی مقالہ

پیش نظر مجموعہ پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی
استاذ شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اُن
مقالات پر مشتمل ہے جو گذشتہ ۱۸، ۱۹ سال میں

موصوف نے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں، اب نظر ثانی کے بعد ان مقالات کو کتابی شکل میں شائع
کیا جا رہا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری خطبہ (خطبہ الوداع) کے علاوہ دوسرے
تمام مقالات ہندی قرون وسطیٰ کے سماجی حالات یا ادبی اور مذہبی تحریکات سے متعلق ہیں جن کا
مطالعہ بہت ہی معلومات افزا ہے۔ طباعت کتابت دیدہ زیب کاغذ عمدہ گلیر۔ سائز متوسط ۲۰×۲۲

صفحات ۳۰۸۔ قیمت: سات روپے، جلد آٹھ روپے
نمونہ وقت المصنفین دہلی ۶